اقبالیاتی ادب

علمی مجلّات کے مقالات کا تعارف

نبیلہ شیخ

اعظم نوید، ''مغرب کا نظریاتی، ثقافتی اور سیاسی غلبہ ختم کرنے کے لیے اقبال کی کاوشوں کا تفصیلی جائزہ''، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، اپریل ۲۰۰۷ء، ص۱۹-۲۹۔

اقبال ان مسلم مفکرین میں سے ہیں جنھیں بیسویں صدی کے آغاز ہی میں مغربی تہذیب اور سیاسی خلفشار کے نہ صرف مشاہدے کا موقع ملا بلکہ اس میں انھیں ایسے محرکات نظر آئے جو ایک طرف اقوامِ مشرق کے لیے تباہ کن تھے تو دوسری جانب خود مغرب کی تباہی پر بھی شاہد تھے۔ اس استعماری تہذیبی یلغار میں اقوامِ مشرق نے جو رعنائی دیکھی اقبال نے اس رعنائی کے باطن میں منافقت، استبداد اور قیصریت کو دریافت کیا اور نفسانیت اور انانیتِ محض کو محسوس کیا۔ مگر ان کی فکر میں یہ بات محض احساس کی حد تک نہ رہی بلکہ اپنے فکری استحکام کے بل پر اقبال نے استعمار کے خلاف ایک باقاعدہ جہاد کا آغاز کیا۔ فرنگ سے متعلق اقبال کی نقد و جرح کے بڑے میدان تین ہیں: ۱-مغربی سیاست، ۲-مغربی معاشرت، ۳-مغربی فکریات۔ علامہ نے اپنے کلام کے ذریعے اسلام کی تہذیب و تمدن کو زندہ کرنے پر ازحد زور دیا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کو مذہب اسلام کے لیے سم قاتل تصور کیا۔ علامہ فرنگ کی فتنہ آفرینی اور فتنہ پروری سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ افرادِ ملت کو مسلسل بتاتے رہے تھے کہ فرنگ کے پردے میں وہی ساحرالموت چھپا ہوا ہے جو اپنے حقیقت ناشناس عقیدت مندوں کو برگِ حشیش دے کر کہتا تھا کہ یہ شاخِ نبات ہے۔ اقبال کا مقصد ہمیشہ ارتقاءِ انسانیت اور معراجِ بشریت رہا۔ اقبال کی نظر میں قومی، نسلی اور ملکی تفریق کی بنا پر انسانیت کی اس برادری میں رخنہ ڈالنا ایک سنگین جرم ہے۔ اقبال مغرب کی مادہ پرستی، وطنیت اور قومیت کی تنگ و تاریک گلیوں میں بھٹکتی ہوئی تہذیبی زندگی سے بے زار تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے فلسفۂ حیات کا اصل محرک ہی مغرب کی تہذیبی زندگی اور اس کا زوال آمادہ معاشرہ تھا۔ اقبال نے اس بات کو پوری طرح واضح کیا ہے کہ لادینی تہذیب کی اساس ہی دین و اخلاق کی دائمی دشمنی پر ہے۔

فرنگی مدنیت ایک ہمہ گیر مہاجنی نظام ہے جس کی بنیاد بے رحمانہ لوٹ کھسوٹ پر رکھی گئی ہے۔ یہ

ظالمانہ معیشت انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں ایک استحصالی قوت کے طور پر عمل پیرا ہے۔ اس لوٹ کھسوٹ کی سب سے بڑی اور واضح علامت یہودیت ہے۔ یہودیت اقتصادی چیرہ دستی کی موجد بھی ہے اور علم بردار بھی۔ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ہیں ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہوچکی ہے۔ اقبال مغرب کے عیوب کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں سے بخوبی واقف اور ان کے مداح بھی تھے۔ ان کی نظر میں علم مومن کی گمشدہ میراث ہے وہ فرنگ کے پاس ہو یا اہل چین کے، مسلمان کو اس کی طرف اس طرح لپکنا چاہیے جس طرح انسان بازیافتہ گم شدہ مال کی طرف لپکتا ہے۔ اقبال مسلمانوں کو اپنے اسلاف کی بنا پر حکمرانی کرتے ہوئے دیکھنے کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ مشرقی قومیں بھی علوم وفنون اور مادیت میں ترقی کر کے وہ تہذیب وتمدن زندہ کریں جس میں اخلاق، محبت، مروت، ہمدردی، اخوت اور مساوات ہو اور یہ صرف اسلام کی پیروی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر جمیل احمد انجم، ''اقبال کا اثر اُردو شاعری پر''، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، اپریل ۲۰۰۷ء، ص۵-۱۸۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اقبال نے اپنی فکر جدید اور طرزِ بیان سے اُردو شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ابتدا سے ہی ان کا اندازِ شعر گوئی اتنا مقبول ہوا کہ معاصر شعرا نے ان کے اسلوب کی پیروی میں نظمیں لکھیں۔ وہ ایک نئے عصر کے معمار ہیں۔ اُردو شاعری کو اقبال کے جس پہلو نے بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان کی انقلابی شاعری ہے۔ اقبال کی انقلابی فکر معاشرے کی ناہمواری اور سرمایہ داری کی حیلہ جوئی میں جکڑی انسانیت کے مشاہدے کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اقبال کی کوششوں سے جدید اُردو شاعری میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا ہوا۔ اقبال کے موضوع 'فضیلتِ آدم' کی بازگشت اس دور کے بہت بڑے شاعر جوش کے ہاں بڑے طمطراق سے ملتی ہے۔ عظمتِ انسان کا ذکر احمد ندیم قاسمی کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ اقبال نے نہ صرف اپنے دور کے شعرا کو متاثر کیا ہے بلکہ آنے والی نسلیں بھی ان کے فکر و انداز کو اپنانے پر مجبور ہوں گی۔

☆☆☆

پروفیسر محسن احسان، ''اقبال اور ترک''، ماہنامہ قومی زبان، کراچی، اپریل ۲۰۰۷ء، ص۳۰-۳۳۔

علامہ اقبال کے ذہنی وفکری ماخذات کا سلسلہ قرآن مجید کے علاوہ بہت سے مشرقی ومغربی فلاسفہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اقبال کے ایک بڑے ممدوح ترکی کے مولانا روم تھے جن کے شاعرانہ اسرار و رموز سے دنیا باخبر ہے۔ ان کی مثنوی شعر ومعرفت کے ساتھ ساتھ اسرارِ دین اور علم کلام کا مجموعہ ہے۔ ترک قوم اور ترکی مزاج وتمدن سے اقبال ابتدا ہی سے آشنا ہوگئے تھے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترکوں کی فتح یابی اور سیاسی کامیابی میں کمال اتاترک کا اہم کردار ہے۔ علامہ نے فارسی نظم ''خطاب بہ مصطفی کمال پاشا''

لکھ کر ترکوں کے ساتھ جذباتی وابستگی کا اظہار کیا۔ علامہ کی اتاترک اور ترکوں کے ساتھ یہ قلبی اور جذباتی وابستگی ان کے اسلامی جذبے کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

ترکی میں اقبال شناسی کے سلسلے میں جن شیدائیانِ اقبال نے کام کیا ان میں محمد عاکب ارصوئے، پروفیسر ڈاکٹر علی نہاد تارلان، ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان، پروفیسر ڈاکٹر علی گنجیلی، ڈاکٹر حسین پرویز، احمد متین شاہین، یوسف صالح، قرہ جاہ صوفی اور ڈاکٹر احمد اسرار اور بہت سے دیگر نام بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر خلیل طوق اُر نے اقبال اور ترک لکھ کر اہل علم و دانش کو اقبال کی فکر سے آگاہی حاصل کرنے کا ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر اسرار احمد، ''علامہ اقبال، قائداعظم اور نظریۂ پاکستان۔ اور۔ اس نظریے سے انحراف کے نتائج''، ماہنامہ میثاق، لاہور، مئی ۲۰۰۷ء، ص ۷-۶۴۔

نظریۂ پاکستان ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس نظریے کی جڑیں اُن صلحائے اُمت کی کاوشوں کے ساتھ پیوستہ ہیں جنھوں نے اکبر کے دین الٰہی کو قبول نہ کیا، وادیِ سندھ کو فتح کیا، انگریز کی حکومت میں تو رہے مگر اس ناگواری کے ساتھ کہ یہ وقت کا تقاضا تھا۔ لیکن اس دوران بھی اپنی حیثیت کو بحال کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ جب دیکھا گیا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت مسلمانوں اور ہندوؤں کو دو مختلف نگاہوں سے دیکھتی ہے اور ہندو بھی اس امتیاز کو بڑھانے میں اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس وقت چند نوابوں نے انگریزی حکومت کو مسلمانوں کی طرف سے وفاداری کا یقین دلانے کے لیے ایک وفد تشکیل دیا جو آگے چل کر مسلم لیگ کے قیام کا سبب بنا۔ اور پھر مسلم لیگ آہستہ آہستہ مسلمانوں کے وجود کے تحفظ سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کے حقوق کی نمایندہ بنی تو محمد علی جناح کو باصرار اس میں شامل کیا گیا۔ لیکن حالات سے مایوس ہو کر وہ انگلستان چلے گئے اور اسی سال علامہ محمد اقبال نے مسلمان حکومت کے قیام کا تصور دیا اور بعدازاں محمد علی جناح کو لندن میں ملاقات کے بعد واپسی پر تیار کیا۔ اگرچہ یہ دونوں شخصیات ابتدا میں اپنے نظریات کے اعتبار سے جزوی طور پر قابل اعتراض تھیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات بدلتے گئے اور یہ اس سیاسی و قانونی شاہراہِ مستقیم پر آ گئے جو آگے چل کر قیامِ پاکستان کی جدوجہد کا محرک اعظم بنی۔ اس جدوجہد میں قائداعظم نے بے مثل کردار ادا کیا اور مسلمانوں کے جوش و جذبے نے اس قائدانہ کردار کو قبول کر کے اپنی منزل کی جانب سفر کو تیز تر کر لیا۔ یوں یہ جدوجہد تہی نظریہ نہ رہی بلکہ بامقصد تحریک کی صورت اختیار کر گئی اور پاکستان وجود میں آیا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مسلمان اپنی تعداد کے اعتبار سے اس قابل نہیں تھے کہ ہندوستان کے اندر ایک الگ مملکت قائم کر سکتے۔ یہ صرف ان کا

نظریہ تھا جس کے بل پر یہ اس قابل ہوئے۔ لیکن افسوس ہے کہ آج نصف صدی کے بعد قائداعظم اور علامہ اقبال کے ان نظریات کو بہت بڑی غلطی کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ علامہ اقبال کی تو پوری فکر موجود ہے جو اس بات کی شاہد ہے کہ وہ کس رُخ پر مسلمانوں کو لے جانا چاہتے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے بھی سیکڑوں بیانات اس بات کو پوری وضاحت سے اہلِ پاکستان کے سامنے رکھتے ہیں کہ انھیں کس طرح کی مملکت درکار تھی۔ ۱۹۳۷ء-۱۹۴۷ء کے دس سال ان کی اس فکری سمت کو واضح طور پر ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ افسوس کہ قائداعظم کی وفات کے بعد ''پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی'' کے مصداق حالات پر اندھیرا چھا گیا۔ معیشت، معاشرت، نظامِ حکومت، نظامِ تعلیم، غرض ہر شعبۂ زندگی بے سمت ہو گیا اور اسلام کا نام اور شناخت ختم کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ یہ قائد و اقبال کے نظریۂ پاکستان کے صریحاً منافی ہے اور اس کے خطرناک نتائج ہم اپنے تمام تر شعبوں کی دگرگوں حالت کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ اس صورتِ حالات سے نکلنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے مقصد اور نظریے کی طرف رجوع کریں۔

☆☆☆

پروفیسر فتح محمد ملک، ''لفظ پاکستان بھی اقبال ہی کی عطا ہے''، ماہنامہ احیائے علوم، لاہور، مئی ۲۰۰۷ء، ص ۶۷-۷۹۔

لفظ پاکستان سب سے پہلے اس گشتی مراسلے میں سامنے آیا تھا جو علامہ اقبال نے ''اب یا کبھی نہیں'' (Now or Never) کے عنوان سے لکھا تھا اور انگلستان میں زیرِ تعلیم چار انڈر گریجویٹ طالب علموں کے نام سے تقسیم کرایا تھا۔ اس میں بالترتیب درج ذیل طالب علموں کے نام دیے گئے: ۱-محمد اسلم خٹک صدر خیبر یونین، ۲-شیخ محمد صادق صاحبزادہ، ۳-رحمت علی چودھری، ۴-عنایت اللہ خان، چارسدہ سیکرٹری خیبر یونین۔

گویا اس زمانے میں اپنے سیاسی نظریات کو اسلامیانِ ہند کی عملی زندگی میں جلوہ گر دیکھنے کی دھن میں قائداعظم جیسے عظیم سیاسی مدبر سے لے کر چودھری رحمت علی جیسے انڈر گریجویٹ طالب علم تک رابطے میں تھے۔ عبدالواحد خان لفظ پاکستان کے حوالے سے لکھتے ہیں ''اب یا کبھی نہیں'' کی اشاعت سے چالیس برس پیشتر بھی لفظ پاکستان اقبال کے ذہن میں موجود تھا۔ اقبال کی شاعری کی اندرونی شہادت یہ ہے کہ جب انھوں نے اپنے کارواں کو عمل کی راہ پر گامزن کرنے کی خاطر اپنی شاعری کو بانگِ درا بنانے کا آغاز کیا تھا تب بھی ان کے ذہن میں لفظ پاکستان موجود تھا۔ برسوں بعد چودھری رحمت علی نے یہ دعویٰ کر کے کہ یہ ان کی تصنیف ہے اپنے طالب علم رفقائے کار کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ راشدہ ملک نے اپنی کتاب دی سپرچوئل فادر آف پاکستان میں یہ ثابت کیا ہے کہ (Now or Never) کے مندرجات اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء اور خطبۂ لاہور ۱۹۳۲ء سے مستعار ہیں اور اپنے اسلوب و ادا کے اعتبار سے بھی ''اب یا کبھی

نہیں'' پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں اقبال کے قلم سے نکلا ہوں۔ چودھری رحمت علی کے طالب علم معاصرین کی تحریروں سے برآمد ہونے والے تاریخی حقائق کی روشنی میں بھی اور اقبال کی شاعری اور فلسفے کی اندرونی شہادت کی بنا پر بھی انھیں نہ تو ''اب یا کبھی نہیں'' کا اصل مصنف تسلیم کیا جاسکتا ہے اور نہ لفظ ''پاکستان'' کا خالق۔ ''اب یا کبھی نہیں'' اقبال کے ذہن کی پیداوار ہے اور لفظ ''پاکستان'' بھی اقبال ہی کی عطا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد معزالدین، ''علامہ اقبال اور عظمتِ آدم''، سہ ماہی الاقربا، اسلام آباد، اپریل-جون ۲۰۰۷ء، ص ۱۷-۴۳۔

علامہ اقبال کے فکر وفن اور تصورِ حیات میں انسان کی حیثیت مرکزی ہے۔ وہ انسان کے شاندار اور درخشاں مستقبل پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ اس کا ذکر اقبال نے اپنی شاعری میں بھی کیا۔ اسرار و رموز میں دراصل انسان کی اسی انفرادی اور اجتماعی عظمت کی تشریح وتفسیر ہے۔ یہ تصور اسرار و رموز تک محدود نہیں بلکہ ان کی شاعری کے ہر دور میں یہ عنصر غالب رہا ہے۔ پیامِ مشرق کی نظم 'میلادِ آدم' اور بالِ جبریل کی نظم ''فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں''، ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''۔ جاوید نامہ میں ''خلافتِ آدم'' کے عنوان سے اقبال کے اشعار نہ صرف انسانی عظمت و برتری کے مظہر ہیں بلکہ انسان کے اعلیٰ وافضل مقام کی آخری حد کی نشان دہی کرتے ہیں کہ وہ روئے زمین پر نائب ایزدی ہے۔ بانگِ درا کی نظم ''انسان'' کا آخری شعر انسان کی تخلیقی قوت کا عکاس ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک معراجِ مصطفیٰ انسانی عظمت کا منتہائے کمال ہے۔ اقبال کی عظمتِ انسانی کے اسی تصور نے ان کے کلام کو آفاقیت بخشی اور وہ دانائے راز کہلائے۔ وہ جاوید نامہ میں وشوامتر، بھرتری ہری، ٹالسٹائی، قرۃ العین، کارل مارکس، نطشے، زرتشت، گوتم بدھ وغیرہ کا ذکر کرکے اپنی انسان دوستی اور ایک دوسرے کے لیے محبت اور رواداری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ عظمت انسانی کے درس کے ساتھ اپنی وسیع النظری اور عالمگیر جذبۂ اخوت کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح اقبال کی شاعری اور فکر وفلسفے کا ایک اہم موضوع انسان کی کھوئی ہوئی عظمت کی بازیافت ہے۔ وہ ایسے معاشرے کی تلاش میں تھے جہاں عزتِ نفس ہو، انسانی عظمت کا احساس ہو، نسلی امتیاز کا خاتمہ ہو، اللہ کی حاکمیت اور احترامِ آدمیت ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر مسرت پروین نیلم، ''اقبال کا تصورِ زمان ومکان''، سہ ماہی پیغام آشنا، اسلام آباد، اپریل-جون ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۰-۱۱۵۔

اقبال محض ایک شاعر نہیں بلکہ مفکر، فلسفی اور حکیم و دانا بھی تھے۔ انھوں نے حیات و کائنات کے بارے میں فلسفہ، نفسیات، الٰہیات اور مابعدالطبیعیات کے فکری رویوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس ضمن میں دیگر

فلاسفہ، صوفیہ اور سائنس دانوں کے نظریات پر گہری نظر ڈالی اور ردّ وقبول کے مراحل سے گذرتے ہوئے برگساں کے فلسفۂ وجدان سے ایک قدم آگے بڑھ کر خودی اور بے خودی کے تصور کو گہرائی سے جانچتے ہوئے زمان و مکان کی اہمیت، لاقانونیت اور الٰہی خدوخال کو نمایاں تر کرنے کی کوشش کی۔ علامہ حیات و کائنات میں مادہ کی ہمہ گیریت سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مادہ محدودیت کی علامت ہے اور فانی ہے جبکہ کائنات تمام تر توحید کی مظہر، لامتناہی خودی کی آئینہ دار اور لافانی ہے جس میں ان گنت زمانے ابھی پوشیدہ ہیں اور جو خودی کے بے کنار سفر میں ظاہر ہوکر رہیں گے۔ کائنات لحہ بہ لحہ حرکت میں ہے۔ ہر سانس، ہر سوچ اور ہر احساس نظامِ حیات کو بڑے قرینے اور ترتیب سے آگے بڑھا رہا ہے۔ متناہی خودیاں تیزی سے لامتناہی خودی میں جذب ہوکر اپنی انفرادیت تسلیم کرانے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔ خدا جو کہ مظہر حیات ہے اپنی لافانیت اور ربوبیت کے اظہار کے لیے حیات کو ہر لحظہ ایک نئے انداز سے متعارف کرا رہا ہے۔ علامہ نے بہت سے فلاسفہ کے حوالے دیے ہیں مگر بحیثیت مجموعی کسی بھی مفکر کے نظریۂ زمان ومکان سے بدرجۂ اتم مطمئن نہیں کیونکہ ہر ایک نے زیادہ تر حیات کے مادی پہلوؤں کو ہی پیش نظر رکھا ہے جو زمان ومکان کے مذہبی وآفاقی تصور کے منافی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر شاہد نوخیز، ''جاوید نامہ ایک پیغامِ عمل''، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (ہند)، مئی ۲۰۰۷ء، ص ۳۸۴-۳۹۳۔

جاوید نامہ علامہ اقبال کے شعری سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ اس میں انھوں نے ''سیر افلاک'' کے عنوان سے ڈرامائی اور دلچسپ انداز میں اپنا فلسفۂ حیات پیش کیا اور نوجوان نسل کو ایک پیغامِ عمل دیا۔ ''خطاب بہ جاوید سخنے بہ نژادِنو'' کے زیرِعنوان انھوں نے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں زندگی کے تمام گوشوں کو منور کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ نئی نسل ایمان ویقین سے بہرہ ور ہوکر رسم کہن کے تار و پود کو بکھیر دے، ظلم و جبر کا خاتمہ ہو اور ایک جہانِ تازہ پیدا ہو جس میں حرکت وحرارت، پاکیزگی و پرہیزگاری، صدق وصفا اور سوز وشوق کی حکمرانی ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد آصف اعوان، ''تحقیق اسلامی کے تقاضے اور اقبال- خطوطِ اقبال کی روشنی میں''، سہ ماہی پیغام آشنا، اسلام آباد، اپریل- جون ۲۰۰۷ء، ص ۹۲-۹۹۔

اقبال کی بنیادی حیثیت ایک فلسفی اور شاعر کی ہے تاہم تعلیم وتعلّم سے بھی ان کی وابستگی اور دلچسپی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اقبال کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہمارے پاس ایسا علمی سرمایہ موجود ہے جو ہمیں ایک طرف قدیم علوم اور بزرگوں کی علمی سرگرمیوں سے آگاہ کر سکے اور دوسری طرف ہمیں اس قابل بنا سکے

کہ ہم اپنے حال اور مستقبل کو سمجھ کر کوئی واضح اور صحیح نقطۂ نظر اختیار کر سکیں۔ اقبال یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس علمی سرمائے کا کھوج لگائیں جو ان کے اسلاف کی میراث ہے۔ اقبال نے ایسے ادارے کے قیام پر بھی زور دیا جہاں علومِ جدیدہ کے فارغ التحصیل حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین مل کر اسلامی تحقیق کا کام جدید خطوط پر کریں۔ اقبال کی نظر میں ایک اسلامی محقق کے لیے بلند نظری اور ذہنی کشادگی بنیادی خصوصیات ہیں۔ وہ ایسی تعلیم اور نصاب کے خلاف ہیں جو تنگ نظری اور تعصب کی فضا پیدا کرے۔ وہ چاہتے ہیں کہ طلبہ کو ان کے رجحانِ طبعی کے مطابق مطالعہ اور تحقیق کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ وہ اس امر کو بھی ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں کہ اسلامی تحقیق کے تقاضے وہ افراد پورے کر سکتے ہیں جن کی سرشت میں لا الہ الا اللہ موجود ہو اور وہ علم کا قرآن و حدیث کی نظر سے تحقیقی جائزہ لینے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیمی نصاب اسلامی تحقیق کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا جائے۔ تاکہ ایسے صاحب علم و حکمت افراد پیدا ہوں جن کے دل نورِ حقیقت سے منور ہوں۔ علومِ جدیدہ کے الحادی پہلو کی رو میں بہہ جانے کی بجائے وہ ان علوم کی مدد سے اسلامی تہذیب کی سچائی کو اسلامی تحقیق کا موضوع بنا سکیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران، ''قادیانیت کی ملت شکنی پر اقبال کی توجہ-ایک مطالعہ''، سہ ماہی الاقربا، اسلام آباد، اپریل-جون ۲۰۰۷ء، ص ۲۶-۴۳۔

اقبال قادیانیت کو مسلمانوں کے ملّی وجود کے لیے دو نمایاں پہلوؤں سے نقصان دہ خیال کرتے تھے۔ اوّل: اس فرقے کے باطل عقائد اسلام کی بنیادی روح کے منافی تھے، دوم: ملکی صورت حال کے تناظر میں اس فرقے کا طرز فکر و عمل جو اس کے مخصوص عقائد کے ہنگامی مفادات کا لازمی نتیجہ تھا اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے یکسر خلاف تھا۔

اقبال نے ایک صاحب بصیرت محقق کی طرح بڑی احتیاط کے ساتھ اس جماعت کے طرزِ عمل اور اعتقادات کا جائزہ لیا، انھوں نے قادیانیوں کے باطل عقائد کی نقاب کشائی خالص علمی اور تاریخی بنیادوں پر کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ دینی اور تمدنی اعتبار سے یہ تحریک اسلام کے لیے کتنا بڑا فتنہ ہے۔ بہائیت اور قادیانیت مجوسیت سے جنم لینے والی دو تحریکیں ہیں۔ بہائی قادیانیوں کی نسبت کھلے طور پر اسلام کے باغی ہیں، جبکہ قادیانی اسلام کی چند اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتے ہیں لیکن باطنی طور پر وہ اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہیں۔ بہائی اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتے اس لیے ان کا غیر اسلامی تشخص وجودِ اسلام کے لیے کوئی خطرہ نہیں لیکن قادیانی اپنی تمام تر گمراہی کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان کہلانے پر اصرار کرتے ہیں۔

اقبال نظریاتی سطح پر اسلام کو ایک عالمگیر قوت کے روپ میں عمل پیرا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایسی

تحریک کو کیوں کر برداشت کر سکتے تھے جو ایک طرف اسلام کی نظریاتی اساس پر وار کر کے اس کی ملّی وحدت کو منتشر کرنے کے درپے تھی تو دوسری طرف ملکی سیاست میں اس کا وظیفہ سیاسی غلامی کی تائید کو الہامی بنیاد فراہم کرتے ہوئے برصغیر کی تحریک آزادی کو بالعموم اور مسلمانوں کے مخصوص مفادات کو بالخصوص نقصان پہنچانا ہو۔ یہی وہ حقائق ہیں جن کی بنا پر اقبال قادیانیت کو اسلام اور ملک دونوں کا غدار کہتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر تحسین فراقی، ''اقبال کا تصورِ تہذیب''، مجلّہ ایران شناسی، لاہور، جون ۲۰۰۷ء، ص ۱۳-۲۶۔

تہذیبوں، ان کے عناصر ترکیبی اور ان کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر اقبال اپنے ابتدائی شعری و نثری آثار سے لے کر اپنے آخری شعری و فکری کارناموں تک اپنے خیالات کی وضاحت کرتے رہے۔ ۱۹۱۰ء میں لکھی گئی ''گورستانِ شاہی'' سے لے کر ''بڈھے بلوچ کی نصیحت'' تک اور ۱۹۰۴ء میں لکھے گئے مضمون ''قومی زندگی'' سے لے کر "The Spirit of Muslim Culture" اور مارچ ۱۹۳۸ء میں لاہور ریڈیو پر نشر ہونے والے اپنے آخری پیغام تک اقبال افراد اور تہذیبوں کی تقدیروں، برگزیدہ اور برتر زندگی اور اعلیٰ تہذیبوں کے مقاصد اور اعمال کو آئینہ کرتے رہے۔ اقبال نے متعدد مقامات پر مسلم تہذیب کو ایک برگزیدہ، برتر اور تاریخ ساز تہذیب کے طور پر پیش کیا ہے۔ اقبال اپنی معاصر یورپی تہذیب کو تہذیب نو، تہذیب حاضر، تہذیب جدید، تہذیب مغرب اور کہیں صرف تہذیب کہہ کر اس کے منفی اور انسان کش عناصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ آج ملت اسلامیہ کو ایک بڑا معرکہ درپیش ہے جسے اقبال کے بڈھے بلوچ نے ''معرکۂ روح و بدن'' سے تعبیر کیا۔ بڈھے بلوچ کی اس نصیحت کو پھر سے سن لینے کی ضرورت ہے، ممکن ہے یہ نصیحت آج کے بہت سے سیکولر مزاج افرادِ قوم کو وہ راہ سمجھا سکے جسے بدقسمتی سے وہ چھوڑتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

ثمینہ چغتائی، ''نظم طلوع اسلام کا ایک تنقیدی جائزہ''، سہ ماہی پیغام آشنا، اسلام آباد، جولائی-ستمبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۷-۱۲۲۔

طلوع اسلام بانگِ درا کی طویل نظم ہے جو اپنی سرمدی کیفیت، پیغمبرانہ بشارت اور جذباتِ مسرت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ یہ نظم ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی تھی۔ علامہ اقبال نے طلوعِ اسلام لکھ کر ترکوں کی فتوحات کو طلوعِ اسلام کا نام دیا اور یہی اس نظم کا مرکزی خیال ہے۔ اقبال اس المناک حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تمیزِ رنگ و نسل، رشک و رقابت، ہوس و خود غرضی، باہمی اختلاف کے سبب امت مسلمہ نے ملّی اعتبار سے بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ آج بھی مسلمان بساط عالم پر اپنا وہی کردار ادا کر سکتے ہیں جو ان کے اسلاف نے ماضی میں ادا کیا تھا لیکن وہ اوصاف پیدا کرنے کی ضرورت ہے جن

کے اکتساب کے بعد انسان انفس و آفاق کو تسخیر کر لیتا ہے اور اس کی حیوانی جبلتوں پر ملکوتی صفات غالب آجاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں واجب ہے کہ تم اپنی صلاحیتوں کو پہچانو، اپنی خودی کو بیدار اور مستحکم کرو۔ رنگ و نسل کے امتیازات کو مٹا کر عالم انسانیت کو اخوت اور محبت کا پیغام دو اور تعمیر انسانیت کے لیے سرگرم عمل ہو جاؤ۔

نظم طلوعِ اسلام نو بندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے لب و لہجے میں زیروبم کی کیفیت پائی جاتی ہے 'صبح روشن' اور ستاروں کی 'تنک تابی' جیسی نرم و گداز تراکیب کے بعد لب و لہجے میں تیزی اور جوش و خروش بڑھتا جاتا ہے۔ طوفانِ مغرب، تلاطم ہائے دریا، ''شکوۂ ترکمانی''، ''جہاد زندگی''، ''سیرتِ فولاد'' اور ''شہیدِ جستجو'' جیسی تراکیب سے احساس ہوا کہ اقبال اپنے افکار و تصورات میں الفاظ کے زور سے کام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس طرح یہ نظم اُمت مسلمہ کی بیداری کے لیے صورِ اسرافیل کا کام دیتی ہے۔

☆☆☆

ثاقبہ رحیم الدین، ''عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے''، سہ ماہی پیغام آشنا، اسلام آباد، جولائی-ستمبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۵-۱۱۶۔

یہ تاریخی سچائی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے دورِ انحطاط میں پیدا ہونے والے شاعر اقبال نے اپنے جاں فزا کلام سے مسلمانانِ ہند جیسی بڑی جماعت کے تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اقبال کی جاوداں شاعری کی اہم خوبی یہ ہے کہ شعر میں خیال، جذبہ، لفظ اور آہنگ گھل مل کر ایک جان ہو جاتے ہیں اور شعر کا جیتا جاگتا وجود سامنے آجاتا ہے۔ اقبال کے عہد میں شاعری کی زبان میں حد سے زیادہ نزاکت اور نڈھال سی نسوانیت پیدا ہو چکی تھی۔ شعرائے جدید کے کلام سے رنگِ تغزل بے جان و بے کیف ہوا جا رہا تھا۔ اقبال کا یقین تھا کہ قنوطی لٹریچر کبھی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے اپنے دور کے اندازِ بیاں اور اسلوب کو بتدریج ترک کر دیا اور اپنے پیامِ شاعری کے لیے اظہار کے نئے سانچے تخلیق کیے۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اقبال کے پیرایۂ اظہار میں تنوع، دل آویزی اور اثر و سوز آتا چلا گیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دورِ آخر کی شاعری جلال و جمال کے رنگوں سے سج کر ساحری بنتی چلی گئی۔ ان کے کلام میں کلاسیکیت اور رومانیت دونوں مکاتب فکر کی لہریں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے معاصر شعرا کی سی منظر کشی نہیں کی بلکہ فطرت کے حسن میں داخل ہو کر اصل معنی کو جھانک کر دیکھا ہے۔ اقبال نیچر کے حسن کو کئی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور پھر اُسے اپنے طرزِ کلام میں سموتے جاتے ہیں۔ رباعیات اقبال کی فنی بلندی کا نادر نمونہ ہیں۔ تمثیل نگاری کا آرٹ، کئی انداز اور روپ میں موجود ہے۔ غرض یہ کہ اقبال کی شاعری فن و فکر کا نادر نمونہ تو ہے ہی نفوذ و تاثیر کا دلنشین نغمہ بھی ہے۔

☆☆☆

ریاض احمد ریاض، ''علامہ اقبال اور دیدارِ الٰہی''، ماہنامہ مرأۃ العارفین، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۷ء، ص ۳۰-۳۳۔

انسان کی فطرت میں خدا کی تلاش کا جذبہ رکھا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے بعد اس کو سکون و قرار حاصل نہیں ہوسکتا۔ تلاش کے اس جذبے نے انسان کو کارخانۂ حیات اور کائنات کی ہر شے پر غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیا اور آخر انسان نے تمام سربستہ رازوں کا فہم حاصل کر لیا جو اس کی ظاہری آنکھ سے پوشیدہ رکھے گئے۔ بقول اقبال 'یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ' اگرچہ ہم ایک ذات کے نور سے الگ ہوئے لیکن ہمارا اصل تک پہنچنے کے لیے تڑپنا اور جدائی و فراق کے صدمے کو برداشت کرنا بھی ہماری فطرت میں رکھا گیا ہے، اسی فراق میں تڑپنا مقصودِ انسانیت ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے دیدار کے لیے انسان سرگرداں رہتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی آدم کی تلاش میں رہتا ہے۔ حضورؐ کو معراج پر طلب کرنا اس قول کی دلیل ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بندہ و آقا دونوں ذوقِ نظر کے سبب ایک دوسرے کے لیے بے تاب ہیں۔ زندگی سراسر جستجو کا نام ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیکھنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے تو اسے پاکیزہ نگاہ سے اس کی قدسیت کو دیکھنا چاہیے۔ علامہ نے اپنے کلام میں بارہا ان جذبات کا اظہار کیا۔ یہ علامہ کی محبت، عشق اور طلب کا معیار ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی غیر چیز کو خاطر میں نہیں لاتے۔ نہ دنیا کی طلب کرتے ہیں اور نہ آخرت اور جنت کی آرزو کرتے ہیں۔ خدا کی عبادت نہ تو دنیا میں کامیابی کے لیے ہے اور نہ عقبیٰ اور بہشت کے حصول کی خاطر ہی۔ اگر ایسا ہو تو اس سے سوداگری اور مطلب براری کی شکل پیدا ہوتی ہے۔ عبادت کی غرض فقط اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشی ہونا ضروری ہے۔ لیکن افسوس کہ آج کا مسلمان ظاہریت کا دلدادہ ہے اور دیدارِ الٰہی کا مشتاق نہیں ہے اور نہ حقیقت کی اس راہ پر چلنا چاہتا ہے۔ اس بھٹکے ہوئے انسان کے لیے اقبال مرشدِ کامل کی دعا کرتے ہیں جو اس کو راہِ راست پر لا سکے۔

☆☆☆

محمد نعیم بزمی، ''نظم جگنو امیجری کے آئینے میں''، ششماہی مخزن، لاہور، شمارہ ۱۳، ۲۰۰۷ء، ص ۶۸-۷۱۔

اقبال کی شاعری کا ایک اہم موڑ اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ فطرت کو پیش منظر کی بجائے پس منظر یا کسی موضوع کی تمہید کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہیں سے ان کی امیجری کا نیا رنگ جلوہ گر ہوتا ہے جس میں فطرت کے امیجز کو فکری، مذہبی، عقلی، تلمیحاتی، شخصی، مابعدالطبیعیاتی و دیگر امیجز کے پہلو بہ پہلو یا زیرِ اثر استعمال کیا گیا ہے۔

نظم جگنو کا آغاز روشنی کی ایک لہر سے ہوا ہے۔ جس سے متنوع، خوش رنگ امیجز پھوٹ رہے ہیں۔ شمع، ستارہ، مہتاب کی کرن، دن کا سفیر، مہتاب کی قبا کا تکمہ، سورج کا پیرہن، یہ سب روشنی کے مختلف ہالے تشکیل دے رہے ہیں۔ ان اشعار میں جگنو کو ایسا پُرنور وجود قرار دیا گیا ہے جو روشنی کے ان ہالوں سے طبعی

انسلاک رکھتا ہے۔ نظم کا پہلا بند اس کاوش کا مظہر ہے۔ جگنو کے لیے ''چھوٹا سا چاند'' کا امیج نظم کے اس بند کی دلکشی میں بے پناہ اضافہ کر رہا ہے۔ پھر جب شاعر چھوٹے سے چاند کو کبھی گہن میں آتا اور کبھی گہن سے نکلتا دکھاتا ہے تو بصری حسن کی تشفی ہوجاتی ہے۔ یوں اقبال روشنی کے ذریعے حرکی امیجز پیدا کرنے پر قادر ہوجاتے ہیں۔ نور سے تحرک اور تحرک سے نور پیدا کرنا ایک اعلیٰ تر جمالیاتی تجربہ ہے۔ جگنو کے اگلے اشعار ایک خاص فکری رو کے پروردہ ہیں اور ایک منضبط جمالیات کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ نظارہ شفق کے لیے 'پری'، سحر کے لیے 'بانکی دلہن' کے امیجز اور بانکی دلہن کی مناسبت سے 'لال جوڑے' اور 'آرسی' کے ذیلی امیجز وقتی طور پر فطرت سے منسوب مسرت اندوزی کا ذریعہ بنتے ہیں لیکن جب اس بند کا آخری شعر آتا ہے تو خالصتاً مسرت اندوزی کی یہ لہر ایک فکری لہر میں بدل جاتی ہے۔

نظم کے آخری بند میں ماقبل بند کے آخری شعر کے منطقی دائرے کو نو بہ نو فطرت سے متعلق امیجز کے ذریعے وسعت بخشی گئی ہے اور پھر اس شعر پہ وحدت الوجودی منطق کی تکمیل کر دی گئی۔ نظم کے حاصل کلام شعر میں بھی جگنو کا ذکر ہے اور اس کی چمک کو پھول کی مہک قرار دے کر شاعر روشنی کی جمالیات کو رنگ و خوشبو سے آشنا کر رہا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ''ڈاکٹر عبدالمغنی: ایک جید نقاد اور اقبال شناس''، مجلّہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۷-۱۴۲۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالمغنی ایک جید نقاد، اقبال شناس اور بھارت کے نامور مسلم دانش ور تھے۔ ان کی رحلت ۵؍ستمبر ۲۰۰۶ء کو پٹنہ میں ہوئی۔ اُن کی وفات اُردو ادب اور اقبالیات خصوصاً بھارت کی اُردو تحریک کے لیے ایک نقصان عظیم ہے۔ مرحوم کا تعلق صوبہ بہار کے ایک علمی خانوادے سے تھا۔ انھوں نے اسکول کالج اور یونی ورسٹی کے امتحانات بڑے امتیاز و اعزاز کے ساتھ پاس کیے۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز لیکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ کئی سال بعد T.S Eliot Concept of Culture کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ کے بی این کالج کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے تو انھیں بہار ایل این متھلا یونی ورسٹی دربھنگا کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ انھی کی دل چسپی و کاوش سے متھلا یونی ورسٹی میں ابوالکلام آزاد مسند (chair) کا قیام عمل میں آیا۔ اسی زمانے میں حکومت بہار کے محکمہ راج بھاشا نے ان کو شیخ شرف الدین منیری اوارڈ مبلغ ایک لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا۔ فرقہ پرستوں کو ایک مسلم چانسلر ہضم نہ ہوسکا تو ان کے خلاف سازش کر کے اور کچھ چھوٹے بڑے الزامات لگا کر انھیں گرفتار کرا دیا گیا مگر جلد باعزت طریقے سے بری ہوگئے۔ بے باکانہ انداز اور مسائل پر محکم طرزِ گفتار ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اپنی تقاریر میں بعض سیمی

ناروں اور کانفرنسوں کے موقع پر لوگوں کی منافقت کو خوب تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ غیر اسلامی تصوف اور مراسمِ خانقاہی کے تو شدید ناقد تھے لیکن ان کا دل صوفی تھا۔ ان کا دل دولتِ دنیا سے بے گانہ رہا۔ فکر آخرت ان کا مطلوب و مقصود رہا۔ وہ اُردو انگریزی میں چھوٹی بڑی ۴۵ کتابوں کے مصنف ہیں۔

اردو انگریزی میں اقبالیات پر ان کی چھے کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات پر انھیں متعدد انعامات پیش کیے گئے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ بہار میں انجمن ترقی اردو کو ایک انتہائی فعال ادارہ بنانا اور اس کے ذریعے اردو کو بہار کی دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دلوانا ہے۔ ان کے انتقال سے اردو زبان اور ادب کو بہت بڑا نقصان پہنچا۔ ان کی وفات سے اُردو دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اسے پُر کرنا یقیناً انتہائی مشکل کام ہوگا۔